مولانا محمد جعفر پھلواروی

ایک حدیث

انفرادی نیکیاں

مسلم، ترمذی اور ابوداؤد تینوں میں سیدنا ابوہریرہؓ سے بالفاظ مختلفہ آنحضورؐ کا ایک ارشاد یوں مروی ہے:

من نفس عن مؤمن كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة۔ ومن يسر على معسر يسر الله عليه في الدنيا والآخرة۔ ومن ستر مسلما ستره الله في الدنيا والآخرة۔ والله في عون العبد ما كان العبد في عون اخيه۔

جو شخص کسی مومن کی ایک دنیوی تکلیف کو دور کرے گا اللہ اس کی اُخروی تکلیفوں میں ایک تکلیف دور فرما دے گا۔ اور جو شخص کسی تنگ دست کی تنگدستی کو دور کرنے گا اللہ دنیا و آخرت دونوں میں اس کی تنگدستی کو دور کر دے گا۔ اور جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے گا اللہ دنیا و آخرت دونوں میں اس کی ستر پوشی فرمائے گا۔ اور اللہ بندے کی مدد پر اسوقت تک رہتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

اس ارشادِ نبویؐ میں جو مرکزی مضمون ہے وہ مکافاتِ عمل کا قانون ہے۔ یعنی جو جیسا کرتا ہے ویسا بھرتا ہے۔ یہاں اگرچہ عمل نیک کی مکافات کا ذکر ہے لیکن اسی میں بدعملی کی مکافات کا ذکر بھی پوشیدہ ہے۔ جب نیکی کا بدلہ نیکی ہے تو بدی کی مکافات بھی بدی ہوگی ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو   از مکافاتِ عمل غافل مشو

اس ارشادِ نبویؐ میں تین باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ (۱) کسی کی تکلیف دور کرنا (۲) کسی کی تنگدستی دور کرنا اور (۳) کسی کی عیب پوشی کرنا۔ چوتھی بات ان تینوں کا خلاصہ ہے بلکہ دوسری خوبیوں کی بھی جامع ہے۔ ان تینوں قسم کی نیکیاں دراصل ایک بڑی مدد ہے۔ اس لیے خلاصہ یوں بیان فرمایا کہ: جب تک کوئی شخص اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے تب تک اللہ بھی اس مدد کرنے

والے کی مدد فرماتا رہتا ہے۔ نہ فقط اس مدد کے کام میں بلکہ خود اس کی اپنی مشکلات میں بھی۔

یہاں چند نکتے پیشِ نظر رکھنے چاہئیں۔

۱۔ تنگ دستی دور کرنے کی جزا یوں بیان کی گئی ہے کہ اللہ ایسا کرنے والے کی تنگدستی دنیا اور آخرت دونوں میں دور فرمائے گا اور اسی طرح ستر پوشی کی جزا میں بھی دونوں جہان کی ستر پوشی حاصل ہوگی۔ لیکن پہلی بات یعنی کسی کی ایک تکلیف دور کرنے کی جزا میں صرف اُخروی جزا کا ذکر ہے۔ دنیوی جزا کا ذکر نہیں۔

یہاں جزائے دنیا کا ذکر نہیں ہے۔ اس عدمِ ذکر کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی نظر کو دنیا سے بے نیاز رکھ کر آخرت پر مرکوز کرنا مقصود ہے۔ اور یوں بھی دنیا کی تکلیف کا دور ہونا اُخروی تکلیف دور ہونے کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی آگے اللہ کا یہ انعام بھی بتا دیا کہ اگر کسی کی تنگدستی دور کر دی جائے یا اس کی عیب پوشی کی جائے تو اس کی جزا دونوں جہان میں ملتی ہے۔ لہذا پہلی بات کی دنیوی جزا کو بھی عام قانونِ مکافات میں داخل سمجھنا غلط نہ ہوگا کیونکہ یہاں اس کی نفی نہیں کی گئی ہے بلکہ آخر میں اس کی تائید ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے تب تک خدا بھی اس کی مدد فرماتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کی کوئی تکلیف دور کرنا اس کی مدد ہی کرنا ہے۔

۲۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہاں انفرادی نیکیوں اور انفرادی جزاؤں کا ذکر ہے۔ اگر یہی چیز اجتماعی شکل اختیار کر لے اور ایسا نظام قائم ہو جائے جس میں ہر ایک کی تکلیف دور ہوتی رہے تنگدستی کا مداوا ہوتا رہے اور عیب پوشی ہوتی رہے تو یہ عین مطلوب ہوگا اور اس کے فوائد دو چند نہیں بلکہ ہزار چند ہوں گے۔ اگر کہیں سَو آدمی الگ الگ اپنی نماز ادا کر رہے ہوں تو اگرچہ یہ انفرادی نماز بھی ادائے نماز کی نیکی ہوگی۔ لیکن اگر یہ سب لوگ ایک امام کی اقتدا میں باجماعت نماز ادا کریں تو عین مطلوب ہی نہیں ہوگی بلکہ اس اجتماعیت کو بلا وجہ انفرادیت میں بدلنا اسلامی تعلیم کی روح کے منافی ہوگا۔ اجتماعی نماز کے جو فائدے، اجر و ثواب اور نتیجہ خیز ثمرات ہیں وہ انفرادی نماز میں ممکن ہی نہیں۔

یوں سمجھیے کہ کسی سوسائٹی میں ہر صاحب استطاعت فرد اپنا صدقہ نکال کر کسی غریب کو دے

دیتا ہے تو بلا شبہہ یہ ایک نیکی تو ہو گی لیکن یہ نیکی کوئی دور رس نتیجہ پیدا نہیں کر سکے گی۔ غربا اپنی حاصل کردہ رقم کو چند دنوں میں کھا پی کر برابر کر دیں گے اور پھر ویسے کے ویسے محتاج رہینگے ایک عارضی فائدہ حاصل کر لیں گے لیکن ان کی مستقل محتاجی کا کوئی علاج نہ ہو سکے گا۔ بخلاف اس کے اگر اجتماعی طور پر تمام صدقات کو اکٹھا کر کے کوئی اجتماعی ادارہ ـــــ مثلاً کوئی کارخانہ ـ قائم کر دیا جائے اور اس میں ان محتاجوں کو کام سکھا کر کھپا لیا جائے تو ان کا مستقل روزگار انھیں سوال کرنے سے اور محتاجی سے محفوظ رکھے گا اور ان کا ہر فرد اپنے متعلقین کے لیے بھی سہارا بن جائے گا۔ یہ صرف ایک مثال ہے جس سے یہ بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اجتماعی کوشش بہرحال انفرادی کوشش سے زیادہ نتیجہ خیز ہوتی ہے۔

اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ اگر ایک شخص کسی مومن کی ایک تکلیف یا تنگی دور کرتا ہے تو بلا شبہہ یہ ایک نیکی ہے لیکن اس سے بہت زیادہ بڑی نیکی یہ ہو گی کہ ایک ایسا وسیع اجتماعی نظام قائم کیا جائے جس میں صرف ایک مومن کی نہیں بلکہ بہت سے مسلمانوں کی، اور ایک ہی نہیں بلکہ بہت سی تکلیفیں دور ہو جائیں اور ہوتی رہیں اور اخلاقی قدریں اتنی ہمہ گیر ہوں کہ فقط ایک دو کی نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ اہل اسلام کی کمزوریوں کی پردہ پوشی بھی ہوتی رہے اور اصلاح بھی جاری رہے۔

ذرا غور فرمایئے۔ آج ہمارا پورا معاشرہ کن کن کربتوں میں مبتلا ہے؟ گرانی، ملاوٹ، فقدانِ اشیا، احتکار، اسمگلنگ۔ یہ سب کچھ غذاؤں میں بھی، دواؤں میں بھی اور دوسری ضروریات زندگی میں بھی۔ پھر چوری، ڈاکہ، دھوکا، ربا، رشوت، استحصال، خویش پروری، اغوا، قتلِ ناحق طبقاتی تفاوت، معاشی اور معاشرتی ناہمواری وغیرہ۔ ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جو باعثِ کربت نہ ہو۔ اگر پورے معاشرے میں انفرادی طور پر کسی کی کربت دور کر دی جائے تو یہ ایک انفرادی خدمت تو ہو گی لیکن عمومی معاشرتی کربت اسی طرح باقی رہے گی اور یہ تقریباً ایسا ہی ہو گا جیسے نجاست میں ڈوبے ہوئے لباس کا ایک گوشہ دھو کر پاک کر لیا جائے۔ ایک گوشے کی پاکی بے شک پاکی ہی کہی جائے گی لیکن ایسے کپڑے کو پہن کر نماز نہ ہو گی جس کا ایک گوشہ تو پاک ہو اور باقی حصے نجاست سے آلودہ ہوں۔ اسلام میں محض چند افراد کی تھوڑی سی نیکی پیدا کرنے

کا تصور نہیں۔ وہ پورے معاشرے کو پاک کرنا چاہتا ہے کیونکہ مختصر سی انفرادی نیکی پورے معاشرے کی بدی سے مغلوب ہونے کے بعد بے نتیجہ سی ہو جاتی ہے۔

آنحضور صلعم نے جو یہ فرمایا ہے کہ: ید اللہ علی الجماعۃ۔ (جماعت پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے) اس کا یہی مطلب ہے کہ اللہ کی مدد اور برکتیں وہیں ہوتی ہیں جہاں محض انفرادیت نہ ہو بلکہ اجتماعی نظام کارفرما ہو۔ اسلام کوئی ایسا "مذہب" نہیں جس میں سارا زور انفرادیت پر دیا جاتا ہے۔ اسلام ایک ایسا "دین" ہے جہاں اجتماعی قوت کی برکت سے انفرادیت بھی قوی تر ہو جاتی ہے۔ سہ

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

زیر بحث روایت میں بہ ظاہر فرد سے خطاب ہے لیکن اس کا مطلب اجتماعیت سے قطع نظر کرنا نہیں۔ قرآن میں واحد کے صیغہ سے اقم الصلوٰۃ۔ (صلوٰۃ قائم کر) اور اٰت ذا القربیٰ حقہٗ۔ (اپنے رشتہ دار کا حق ادا کر) وغیرہ بھی آیا ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا مخاطب پورا معاشرہ نہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صحیح اجتماعی نظام کی تکمیلِ فرض میں بہ تقاضائے بشری کچھ کسر یا کمی رہ جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر فرد اپنی صوابدید سے اس خلا کو پر کر دیتا ہے۔ یہ وہ "نفل" ہے جو انفرادیت کو مزید قوت بخشتا ہے۔ یہ وہ نفل نہیں جو اجتماعی فرض سے ہٹ کر ہو بلکہ یہ فرض سے زائد بہت بڑی نیکی ہوتی ہے اور فرض کے مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کرتی ہے۔

بخاری کتاب الرقاق باب التواضع[1] میں ایک حدیث قدسی بڑی معنی خیز اور فکر انگیز ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

..... میرا بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے تو میں (اللہ) اس سے اس قدر محبت کرنے لگتا ہوں کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھ بن جاتا

---

[1] جلد دوم صہ ۹۶۳ طبع اصح المطابع

ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔.....

ذرا سوچیے، نوافل کے ذریعے کتنا اعلیٰ درجے کا تقربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے لیکن کیا یہ درجہ محض نوافل سے حاصل ہو جاتا ہے اور فرائض کا اس میں کوئی دخل نہیں ؟ تو بہ توبہ ایسی بات نہیں۔ اس حدیثِ قدسی کا اس سے پہلا جملہ اس غلط فہمی کو دور کر دیتا ہے جو یوں ہے:

ما تقرب عبدی بشئی احب الی مما افترضت علیہ۔

میں (اللہ) نے اپنے بندے پر جو کچھ فرض کیا اس سے زیادہ میری محبوب چیز اور کوئی نہیں جس کے ذریعے میرا بندہ تقرب حاصل کرتا ہے۔

اس ارشاد سے یہ چیز بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ تقرب الی اللہ کی اساس فرائض ہوتے ہیں اور نوافل کا شمار فرائض کے توابع و لواحق میں ہے۔ اگر فرائض ہی نہ ہوں تو نوافل کا کوئی وزن نہیں رہتا۔ فرض نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے اور نفل نمازیں انفرادی ہوتی ہیں جو الگ الگ ادا کی جاتی ہیں۔ اگر فرض نماز ہی ادا نہ کی جائے تو فقط نفل نمازوں کی کیا قدر و قیمت رہ جائے گی ؟ نوافل تو ہوتے ہی اس غرض سے ہیں کہ فرائض میں جو کسر رہ جائے اس کی تلافی نفل سے ہو جائے۔ نفل سے کسر تو پوری ہو سکتی ہے لیکن اصل فرض نہیں ادا ہو سکتا۔

اب یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ روایت میں جو انفرادی تخاطب ہے وہ اجتماعی تخاطب کا لاحقہ ہے نہ کہ اجتماعی نظام سے قطع نظر۔ یعنی اسلام کا اصل مقصد تو ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں کربت کا وجود ہی باقی نہ رہے اور ہر ایک کی کربت طویل پریشانی اٹھائے بغیر ہی دور ہوتی رہے اور اس اجتماعی نظام میں اگر کوئی کسر رہ جائے تو وہ انفرادی نفل سے دور ہو جائے۔

نفل کا تعلق صرف نماز سے نہیں، ہر وہ کام نفل ہے جو معیّن فرض سے زائد کیا جائے۔ یوں سمجھیے کہ ایک ملازم کی ڈیوٹی چھ گھنٹے کام کرنے کی ہے اور وہ اپنی خوشی سے سات گھنٹے کام کرتا ہے اور کوئی فاضل الاؤنس طلب نہیں کرتا۔ اپنی اسی تنخواہ میں سات گھنٹے کی ڈیوٹی دیتا ہے، تو ظاہر ہے کہ افسر کی نگاہ میں اس ملازم کا مرتبہ بلند ہوگا اور وہ اس کے تقرب کا ذریعہ ہوگا۔ لیکن یہ تقرب اس لیے نہیں کہ چار بجے سے پانچ بجے تک کام کیا بلکہ اس لیے ہے کہ دس

بجے سے چار بجے تک اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے بعد ایک گھنٹہ مزید محنت کی یعنی اصلی فریضے پر ایک نفل کا اضافہ کیا۔ پس عوام کی کربت و مصیبت کو دور کرتے رہنا تو پورے نظام کا فرض ہے اس پر اگر کوئی انفرادی حیثیت سے نفل کا اضافہ کرتا ہے تو اس کا یہ ایثار و اخلاص اللہ کی نگاہ میں قابلِ قدر ہے اور وہ اس کی جزا ضرور دے گا۔ یہ نفل اصل فرض سے الگ نہیں ہوتا بلکہ فرض ہی کا ایک لاحق اور تابع ہوتا ہے۔ انفرادی نیکیوں کی جتنی زیادہ کثرت ہو اتنی ہی زیادہ خیر و برکت ظہور میں آئے گی لیکن یہ انفرادیت اگر اجتماعیت کی روح سے غافل کر دے تو پورے دینی نظام کو مذہبیت کے تنگ تصور میں تبدیل کر دیتی ہے۔

مذکورہ بالا ارشاد نبوی میں خلاصہ کلام یوں بیان کیا گیا ہے کہ "جب تک کوئی بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے اس وقت تک خدا بھی اس کی مدد فرماتا رہتا ہے۔"

ایک لفظ "عون" میں ہر قسم کی اعانت و امداد آجاتی ہے۔ اخلاقی، دینی، سیاسی، معاشی معاشرتی، علمی اور ذہنی اعانتیں اس عون میں داخل ہیں اور ہر عون و مدد کسی نہ کسی کربت کو دور کرتی ہے۔ تنگ دستی کو دور کر دینا معاشی مدد ہے اور کمزوریوں کی ستر پوشی اخلاقی و ذہنی امداد ہے اور یہ سب کچھ کسی نہ کسی کربت کو دور کرنے ہی کی ایک شکل ہے۔

اس خلاصۂ حدیث کے دو واضح مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جو شخص اپنے بھائی کی امداد کرتا ہے اس شخص کی امداد اللہ تعالیٰ خود اس کی مصیبت میں کرتا ہے اور یہ اس کی نیکی کی جزا ہوتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کی مشکل دور کرنے میں کوئی شخص مدد کرتا ہے تو اللہ بھی وہ مشکل دور کرنے میں اس مدد کرنے والے کی اعانت فرماتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک مدد کرنے والے کی اللہ مدد فرماتا ہے تو زیادہ مدد کرنے والوں کے ساتھ خدائی مدد بھی زیادہ ہوگی اور اگر پورا نظام معاشرہ بیکسوں کی مدد میں لگ جائے تو خدا کی مدد بھی بھرپور وسعتوں کے ساتھ اس کی پشت پناہ بن جائے گی اور پھر کوئی ایسی قومی مشکل نہ ہوگی جو حل نہ ہو سکے۔ اسی کو کہتے ہیں "اپنی مدد آپ"۔ فرد کی معمولی مشکل کو ایک فرد بھی دور کر دیتا ہے لیکن اجتماعی مشکلات کو اجتماعی تعاون و امداد ہی کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے۔

ہم سیلاب سے گھبرا جاتے ہیں۔ گرانی سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ موسمی سختیوں سے

بدحواس ہوجاتے ہیں۔ معاشی ناہمواریوں، بیماریوں اور دوسری تباہ کاریوں کو عذاب الٰہی اور قضائے مبرم سمجھ کر مایوس ہوجاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ سب اجتماعی کربتیں اور مشکلیں ہیں لیکن ان کو عذاب الٰہی کی آخری مہر سمجھنا صحیح نہیں۔ اصل عذابِ الٰہی تو وہ ہوتا ہے جو انبیا کی پوری مخاطب اُمّت کو نیست و نابود کر دیتا ہے اور صرف اہل ایمان کو بچا لیتا ہے۔ یہاں وہ صورت نہیں۔ اگر عذاب ہوتا تو تمام کے تمام بدکردار ختم ہوجاتے اور سارے کے سارے نیکوکار محفوظ رہ جاتے۔ لیکن یہاں یہ صورت بالکل نہیں۔ بہت سے اہل ایمان ختم ہوگئے اور بہت سے بدمعاش محفوظ رہ گئے۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر یہ عذاب نہیں تو اسے کیا کہا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسے آزمائش، فتنہ اور ابتلا کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ ایسی ابتلائیں ہر امت اور ہر قوم پر آتی رہتی ہیں۔ بے جان اور بے کار قومیں ایسے موقعوں پر مایوس ہوجاتی ہیں اور ماتھا پکڑ کر رونے بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن زندہ قومیں جب ایسی آزمائشوں سے گزرتی ہیں تو سرخ رُو ہو کر نکلتی ہیں۔ وہ اس بھٹی سے کندن بن کر نکلتی ہیں۔ پھر ایک تازہ ولولے، جدید جذبے اور نئے حوصلہ و عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور تعمیر نو کے نشے سے سرشار ہوکر پچھلے نقصانات کی تلافی کرلیتی ہیں۔ آئندہ کے نقصانات سے بچاؤ کا سامان کرکے نئے دورِ زندگی کا آغاز کرتی ہیں۔ سب مل کر ایک دوسرے کی کربتوں، کلفتوں اور مشکلوں کو دور کرتی ہیں اور اس اجتماعی تعاون و مدد کے پہلو بہ پہلو اللہ تعالیٰ کی پوری مدد و نصرت بھی شامل ہوجاتی ہے۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا